کرنے کا یہ مخصوص قانونی فریم ورک انسان کو تعلقات کی ایک اکائی کے طور پر نہیں بلکہ ایک " قائم بالذات مجرد فرد" کے طور پر دیکھتا ہے۔ یہ مجرد فرد خود کو صرف ایک ایسی ذات کے طور پر پہچانتا ہے جو اپنی ذاتی آزادی میں بے پناہ اضافے کا خواہاں ہوتا ہے۔ چنانچہ ہیومن رائٹس فریم ورک کی کمٹمنٹ کسی بھی سماجی اکائی کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتی (سوائے سرمایہ دارانہ مارکیٹ کے، البتہ یہ ایک الگ موضوع ہے)، یہ فریم ورک صرف "ہیومن" (بطور مجرد فرد) کے حقوق کو ڈیفائن کرنے اور ان کا تحفظ کرنے کی یقین دھانی کراتا ہے۔ یہ فریم ورک فرد کو میاں بیوی، ماں باپ، بیٹا بیٹی جیسی شناختوں میں پہچاننے، ان کے حقوق متعین کرنے اور ان کا تحفظ کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ چنانچہ "تحفظ خواتین بل" اس رویے کی ایک تازہ ترین مثال ہے جسے اس امر میں تو دلچسپی ہے کہ "عورت بطور ایک فرد" کا تحفظ کیسے ممکن ہے، مگر یہ اس سوال سے کلیتاً سہو نظر کرتا ہے کہ کیا اس میں ایک "بیوی" کا تحفظ بھی ہے؟

مذہبی حلقوں کا اس قانون یہی بنیادی اعتراض ہے کہ آخر اس قانون سے ایک بیوی محفوظ ہوگی یا برباد؟ اور نتیجتاً کیا خاندان کی اکائی مضبوط ہوگی یا کمزور؟ اس بل کے حامیوں کو اس اہم ترین سوال کے جواب سے کوئی غرض نہیں۔ تاریخ کا سفر یہ بتاتا ہے کہ ہیومن رائٹس فریم ورک سے ماخوذ یہ قوانین بیوی و شوہر جیسے رشتوں کو معدوم کر کے خاندان کی اکائی کو نیست و نابود کر دیتے ہیں اور بالاخر "اکیلا فرد" باقی بچ رہتا ہے۔ یہ بنیادی بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اسلام "مرد و عورت کے حقوق" نامی عنوان باندھ کر کسی کو حقوق نہیں دیتا، ہر کسی کو جو بھی حقوق دیئے گئے ہیں وہ ان "مخصوص تعلقات" سے وجود میں آنے والی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے عطا کیے گئے ہیں جنہیں اسلام مطلوبہ معاشرتی تعلقات کے طور پر دیکھتا ہے۔ چنانچہ معاشرتی حقوق کی بنیاد شوھر، باپ، بیوی و ماں وغیرہ ہونا ہے، نہ کہ مجرد مرد یا عورت ہونا۔ جو علمی فریم ورک تعلقات کی ان جاحت سے سہو نظر کرتے ہوئے مرد و عورت کو مجرد حیثیت میں حقوق دینے پر اصرار کرتا ہے، وہ لازماً ان تعلقات کو نیست و نابود کر دیتا ہے کیونکہ اس فریم ورک میں حقوق کی تفصیلات ان مخصوص ذمہ داریوں کی ادائیگی کے تناظر میں طے ہی نہیں کی جاتیں جو ان تعلقات کی بقا کی ضامن ہو۔ حقوق بذات خود مطلوب نہیں ہوتے بلکہ مخصوص فرائض کی ادائیگی کے لیے عطا کیے جاتے ہیں۔ اگر فرائض کا تصور مختلف ہوگا تو حقوق کی تفصیلات بھی مختلف ہوگی، اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ اس قسم کے گھریلو تشدد کو کیسے ختم کیا جائے، تو اس کا جواب ہے گھریلو تعلقات کے نگران افراد اور اداروں کو مؤثر بنا کر۔ قرآن مجید میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان علیحدگی کا خدشہ ہو تو دونوں کی طرف سے حکم مقرر کرو جو ان کے مابین صلح کی کوشش کریں۔ چنانچہ خواتین پر تشدد کو ختم کرنے کے لیے "حکم کے ادارے" کو مؤثر بنانے کے لئے قانون سازی اور کوششیں کرنے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں درج ذیل نوعیت کے اقدامات اٹھائے جا سکتے ہیں:

- قانونی مداخلت کا بنیادی مقصد "عورت بطور فرد" نہیں بلکہ ایک "بیوی" کو تشدد سے تحفظ دینا ہے۔
- تشدد کی روک تھام میں پولیس کی مداخلت کم از کم ہونی چاہیے۔ شکایات کے ازالے کے لیے ایسے سماجی افراد، تعلقات اور اداروں پر انحصار کرنا چاہیے جو سماجی و نفسیاتی اعتبار سے قابل قدر و لحاظ سمجھے جاتے ہیں۔

- اس کے لیے نکاح رجسٹرار اور قاضی کے کردار کو قانونی طور پر مؤثر بنایا جائے، یعنی پولیس کے بجائے نکاح رجسٹرار کے پاس شکایت درج کرائی جائے۔ نکاح رجسٹرار کو جب کوئی شکایت موصول ہو تو بجائے اس کے کہ بیوی ازخود شوہر کو گھر سے نکال دے یا پولیس اسے جیل بھیج دے، نکاح رجسٹرار و قاضی دونوں طرف کے ذمہ داروں (حکمین) کو معاملے میں شامل کر کے مسئلہ حل کرانے کا پابند ہو۔
- اس سلسلے میں فریقین کو تھانے کے بجائے مقامی مسجد یا مدرسے میں بلایا جائے اور امام صاحب کے روبرو اور ان کی زیر نگرانی کاروائی کی جائے۔
- متعلقہ مرد اور خاتون دونوں کو کچھ عرصے کے لیے مسجد و مدرسے کے امام و مہتمم صاحب کی زیر نگرانی تعلیم و تربیت کا پابند بنایا جائے یعنی مرد اور خاتون دونوں ان تعلیمی و تربیتی نشستوں میں شامل ہونے کے پابند ہوں۔
- اگر مرد اس پورے عمل میں تعاون نہ کرے تو نکاح رجسٹرار اس تعاون کو ممکن بنانے کے لیے حسب ضرورت و حکمت پولیس کی مدد لے سکتا ہو۔

الغرض مداخلت کا مقصد گھریلو مسائل کا ایسا حل تلاش کرنا ہونا چاہیے جو گھر کی اکائی کو برقرار رکھتے ہوئے مسئلے کو حل کر سکے اور یہ تب ہی ممکن ہے جب ان مسائل کے حل کے لیے سماجی طور پر معتبر سمجھے جانے والے افراد اور اداروں کو مؤثر طور پر شامل معاملہ کیا جائے۔ میاں بیوی کا تعلق کارخانے دار اور مزدور کا نہیں کہ آج ایک کارخانے دار تو کل دوسرا، یہ محبت و خلوص پر مبنی عمر بھر ساتھ نبھانے کا بندھن ہے اور انہی کے فروغ میں اس کی بقا ہے۔ حکم کا مؤثر کردار اور تعلیم و تربیت کا مناسب انتظام ہی وہ راستہ ہے جو فی الواقع ہمارے یہاں ایک بیوی کو شوہر کے تشدد سے نجات دلا سکتا ہے۔ عورت کی پٹائی بنیادی طور پر پیٹنے والے اور مار کھاتی بیٹی و بہن کا ساتھ نہ دینے والے مردوں کی کمزوری و تربیت کے فقدان کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جس بدقسمت بیوی کو اس کا باپ، بھائی، بیٹا، شوہر اور دیگر خاندانی تعلقات مرد کی پٹائی سے نہیں بچا سکتے، مغربی اقوام کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ خواتین کے تحفظ جیسے حالیہ بل زیادہ دور اور دیر تک اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس نوعیت کے تمام تر قوانین کے باوجود مغرب میں 50 فیصد سے زائد "خواتین" آج بھی مردوں کے ہاتھوں سے پٹتی ہیں۔ ہمارے یہاں بھی یہ اپنی نوعیت کا کوئی اچھوتا بل نہیں جسے منظور کیا گیا ہو، اس طرح کے بل ماضی میں بھی منظور کیے گئے ہیں تاہم عورت اسی طرح سے مظلوم ہے۔ اس پر سب سے بڑی دلیل پاکستان میں نشر ہونے والے دو درجن سے زائد وہ کرائم شوز ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پولیس اور دیگر حکومتی اداروں کی سرپرستی میں ہی عورتوں کی خرید و فروخت، جسم فروشی، جبری زنا وغیرہ کا کام جاری و ساری ہے۔ اس خدشے کو بھی کلیتاً نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ منظور شدہ بل کے ذریعے مالی مفادات سمیٹنا مقصود ہو کیونکہ جس انداز سے نئے ادارے قائم ہوں گے، افراد کو بھرتی کیا جائے گا، ڈونرز سے چندے وصول کیے جائیں گے اس سب سے "اصل مسئلہ" حل ہو یا نہ ہو البتہ کچھ تحقیقی اداروں، این جی اوز اور سرکاری افریان کے مالی مسائل ضرور حل ہو جائیں گے۔

تعارف وتبصرہ

ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی

''فقہائے احناف اور فہم حدیث۔اصولی مباحث''

حال ہی میں جناب پروفیسر عمار خان ناصر کی کتاب "فقہائے احناف اور فہمِ حدیث۔اصولی مباحث" کتاب محل لاہور سے طبع ہو کر آئی ہے۔کتاب اس کش مکش کو حل کرنے کی کوشش ہے جو برصغیر میں حنفی مدارس کے درسِ نظامی کے ہر ذہین طالب علم کو پیش آتی ہے کہ اگر صحاح ستہ کے اس ذخیرہ احادیث پر جو داخل نصاب ہے اور جن میں سے بعض کتب کو اَصح الکتب قرار دیا جاتا ہے، احکامِ شرعیہ کا مدار ہے تو حنفی فقہ کے حدیث سے مستنبط ہونے پر ایک بڑا سوالیہ نشان لگ جاتا ہے اور اگر حنفی فقہ کی زیرِ تدریس کتب میں مذکور ادلہ مستند ہیں تو کیا عقل وقیاس کی اساس پر صحیح احادیث سے صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے یا صحیح اور مستند ترین روایات پر دوسرے اور تیسرے درجے کی کتب احادیث کی روایات کو ترجیح دی جا سکتی ہے؟ اس کش مکش کے نتیجے میں یا تو فقہ حنفی کا یہ دعویٰ مخدوش معلوم ہونے لگتا ہے کہ اس کی بنیاد کتاب اللہ کے بعد سنت نبوی پر ہے یا یہ خیال پختہ ہونے لگتا ہے کہ احادیث کے اخذ وقبول میں حنفیہ مخصوص انتخابی رجحان کے حامل ہیں۔

اس کش مکش کا اصل سبب یہ ہے کہ مدارس میں داخل نصاب کتب احادیث کی تفہیم اور ان سے استدلال کے لیے جو اصولِ حدیث پڑھائے جاتے ہیں، وہ ان اصول سے مختلف ہیں جن کی اساس پر داخل نصاب کتب فقہ کی تدوین کی گئی ہے۔اس تضاد کی وجہ سے طلبہ کے ذہن میں یہ تصور جاگزیں ہو جاتا ہے کہ حنفی فقہ اور احادیث میں یکسانی کا فقدان ہے۔ستم بالائے ستم یہ کہ حنفی مدارس میں جو اصولِ حدیث کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، وہ حنفیہ کے نہیں بلکہ محدثین کے اصول بیان کرتی ہیں اور طلبہ موقوف علیہ اور دورہ حدیث کے دوران احادیث کو انہیں اصول پر پرکھنے کی مہارت بہم پہنچاتے ہیں۔حنفیہ کے اصولِ حدیث مختلف ہیں لیکن وہ تدریس حدیث کے مقدمہ کے طور پر نہیں بلکہ اصولِ فقہ میں ضمناً پڑھائے جاتے ہیں اور ان کی مناسب تطبیقی مشق بھی نہیں کرائی جاتی۔اگر اصولِ حدیث کی تدریس کے دوران صرف محدثین کے اصول پڑھانے کی بجائے حنفیہ اور محدثین دونوں کے اصول کی نہ صرف تدریس بلکہ مُقارنہ کر کے ثمرۂ اختلاف اور نتائج سے متعارف کروایا جائے تو یقیناً طلبہ ذہنی کش مکش میں مبتلا ہونے کی بجائے دورانِ تعلیم ہی یک سُو ہو سکتے ہیں۔مزید برآں مدارس میں حدیث کی تدریس کا انداز اس طرح کا اختیار کیا جاتا ہے جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ایک صحیح حدیث کے مقابلے میں مناظرانہ جوابات کے انبار لگا دیے گئے ہیں۔ہر چند کے اساتذہ دورانِ بحث یہ باور کرتے ہوں گے کہ انہوں نے درجنوں اور بیسیوں جوابات قلم بند کروا دیے ہیں، لیکن طلبہ کے ذہن سے یہ

بات نہیں کھر چی جا سکتی کہ صحیح احادیث کو مصنوعی جوابات سے رد کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اس ساری صورت حال کا واحد سبب یہ ہے کہ مدارس میں حنفیہ کے اصولِ حدیث کی تدریس کا مستقلاً اہتمام نہیں ہے، ورنہ بلاشبہ جس طرح فقہ حنفی کی اساس باقی تمام مذاہبِ فقہیہ کی بہ نسبت زیادہ علمی، فکری، عملی اور بین الاقوامی رجحان کی حامل ہے، اسی طرح حنفیہ کے اصولِ حدیث اس نوعیت کے ہیں کہ تاریخ کے طویل ادوار کی منظّم تحریکیں اور حجیت سنت کے خلاف ہونے والی علمی اور فکری محاذ آرائی نے انہیں سر مو متاثر نہیں کیا۔

اکثر محدثین کے برعکس حنفیہ نے شروع ہی سے حدیث اور سنت میں واضح خطِ امتیاز کھینچ کر حدیث کو نہیں بلکہ سنت کو حجت قرار دیا اور سنت کی بنیاد اسناد و متون پر رکھنے کی بجائے تعامل اور تواترِ عملی پر رکھی۔ نیز سنت میں تشریعی اور غیر تشریعی کی تقسیم کرتے ہوئے سنت کو کتاب اللہ کی تبیین و تفسیر قرار دیا۔ چنانچہ انہوں نے بجا طور پر یہ نقطہ نظر اختیار کیا کہ تشریعی سنن کا بیان اور ان کے مطابق سماج کی تشکیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسی طرح فرضِ منصبی تھا جیسے تعلیم کتاب وحکمت۔ پس حنفیہ اور مالکیہ نے اپنے مذاہب فقہیہ کے لیے تقریباً سارہ ذخیرۂ سنن_ متون اور ان کی معاشرتی تطبیق_ کھنگال کر اپنے مذاہب مدون کیے۔ یہی وجہ ہے کہ جن سنن کو اولین ائمہ مجتہدین نے اپنا مستدل قرار دے کر ان پر اپنے مذاہب کی بنیاد رکھی، بعد کے کسی مؤلف کی بیان کردہ اسناد کی اساس پر انہیں چیلنج کرنے کو اہل علم نے کبھی درست قرار نہیں دیا۔

اگرچہ محدثین نے احادیث کی جمع وتدوین اور ان کی ہر نوع کی جانچ پرکھ کے حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیے، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ تشریعی احادیث کی نہ صرف جمع وتدوین کا کام محدثین کی کاوشوں کے آغاز سے پہلے ہی فقہاء مکمل کر چکے تھے بلکہ ان کو مدارِ استدلال بنا کر اپنے مذاہب فقہیہ بھی مدون کر چکے تھے۔ یہ محدثین ہیں جنہیں فتنہ وضعِ احادیث کا سامنا کرنا پڑا اور انہوں نے اس کے مقابلے کے لیے جرح وتعدیل اور اسماء الرجال کی عظیم الشان لائبریری تشکیل دے دی لیکن یہ چیلنج ائمہ مجتہدین بالخصوص حنفیہ و مالکیہ کو پیش نہیں آیا کیوں کہ وہ اپنے مذاہب کی بنیاد سنن متداولہ پر رکھ چکے تھے اور کوئی موضوع حدیث سنن متداولہ کو چیلنج نہیں کر سکتی تھی۔

ماضی قریب میں جن مستشرقین نے حدیث کو موضوعِ بحث بنایا، ان میں گولڈ زیہر Goldzeihr اور شاخت Schacht کو مغرب میں اس قدر اہمیت حاصل ہوئی کہ ان کے منہجِ تحقیق کو موضوعِ بحث بنانا "توہین اکابر" کے زُمرے میں آتا ہے۔ انہوں نے جزوی روایات اور واقعات سے کلی نتائج اخذ کرتے ہوئے یہ نقطہ نظر اختیار کیا کہ:

۱۔ سلسلہ سند کا آغاز پہلی صدی کے اختتام اور دوسری صدی کے شروع میں ہوا، اس سے پہلے نہیں تھا۔

۲۔ محدثین نے متونِ حدیث کی نقد کا کام نہیں کیا، اس لیے کئی احادیث عقل کے خلاف ہیں۔

۳۔ جس طرح متن وضع کرنا آسان تھا، سند وضع کرنا اس کی بہ نسبت زیادہ آسان تھا۔

۴۔ سیاسی اور کلامی اختلافات کے عہد میں متون بمع اسناد وضع کیے گئے۔

۵۔ شاخت کے بقول مذاہب فقہیہ کے ابتدائی دور میں فقہی اقوال علماء وفقہاء کی طرف منسوب کیے جاتے تھے اور ان کے مآخذ مقامی قوانین اور رسوم ورواج تھے۔ ان اقوال کو احادیث نبویہ کا درجہ بعد میں دیا گیا اور ان کو مستند بنانے کے لیے سند متصل وضع کی گئی۔ جہاں کہیں مکمل، متصل سند موجود ہوگی، وہاں وضع کا احتمال زیادہ ہوگا اور اگر یہ معلوم کرنا